سیّد محمد محیط طباطبائی اور جاوید نامۂ اقبالؒ

ڈاکٹر محمد سلیم اختر☆

اسے محض اتفاق کہیے یا حالات کی ستم ظریفی کہ اپنی حیاتِ طبعی کے دوران جن ایرانی اصحاب علم و اقتدار کے ساتھ حضرت علامہ اقبالؒ کا بالواسطہ یا بلاواسطہ ذاتی تعارف ہوا یا قلمی روابط کی برقراری تک نوبت پہنچی، اُن کی تعداد معدودے چند افراد سے زیادہ نہیں۔ ایسے ہی اہل علم میں سے ایک سیّد محمد محیط طباطبائی بھی تھے، جن کے اقبالؒ کے ساتھ رابطے کی تفصیل آپ آئندہ سطور میں ان کے اپنے ہی قلم سے ملاحظہ فرمائیں گے۔

سیّد محمد طباطبائی ۱۳۲۰ عیسوی میں زوارہ[1] کے ایک نواحی گاؤں گزلا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سیّد ابراہیم زوارہ ای کے زیرنگرانی حاصل کی۔ مزید علم حاصل کرنے کی لگن آپ کو پہلے اصفہان لے گئی، پھر آپ تہران جا کر دارالفنون میں داخل ہوگئے۔

آپ کو عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ آپ ایک عرصے تک ایک علمی و سیاسی مجلّہ ''محیط'' کے نام سے شائع کرتے رہے۔ کچھ مدت کے لیے مجلّہ ''معارف'' کے مدیر بھی رہے۔ اس کے علاوہ کوئی دس ایک برس تک معروف ایرانی ریڈیو پروگرام ''مرزہائے دانش'' کی نگرانی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ آپ کی علمی تگ و دو کا دور سات دہائیوں سے زیادہ عرصے پر محیط ہے جس کے دوران آپ نے مختلف علمی، ادبی، تاریخی اور سیاسی موضوعات پر بکثرت قلم فرسائی کی۔ آج سے کوئی دس بارہ برس قبل تک آپ کے کوئی دو ہزار مقالے، رسالے، اور تقاریر شائع ہو چکی تھیں۔ آپ کی انہی تحریروں کے انتخاب پر مبنی آپ کی زندگی ہی میں آپ کے صاحبزادوں اور احباب کی کوشش سے آپ کے مقالات کے مندرجہ ذیل مجموعے زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے تھے:

- آنچہ دربارۂ حافظ باید دانست
- تاریخ تحلیلی مطبوعاتِ ایران

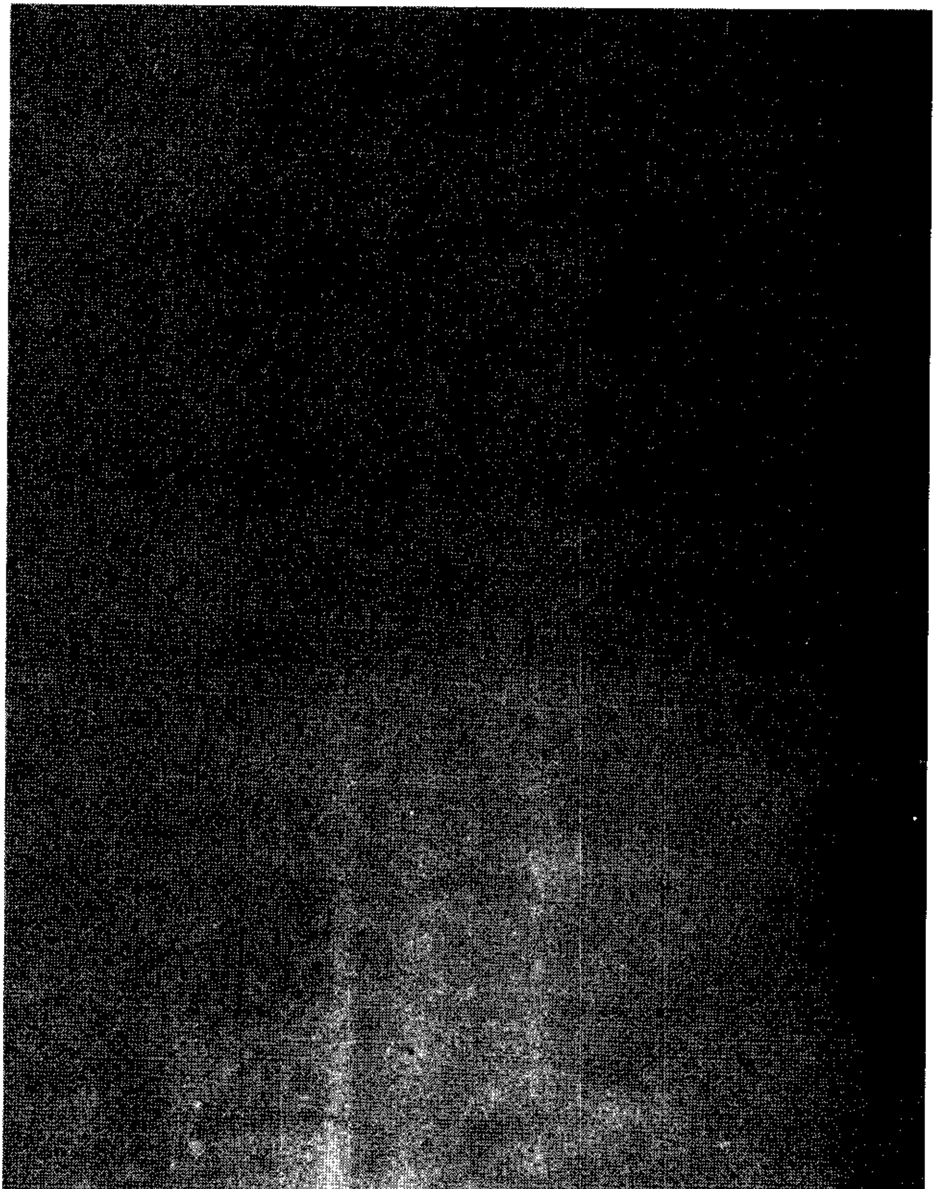

اقبال کی طرف سے جاوید نامہ کے تقدیمی نسخے کے سرورق کا عکس

- خیامی یا خیام،[۲] اور
- سیّد جمال الدین اسد آبادی و بیداری مشرق زمین[۳]

اس کے علاوہ انہوں نے اپنی جوانی میں معروف ایرانی مصلح میرزا ملکم خان کے آثار کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا۔[۴]

سیّد محمد محیط طباطبائی کو جن ممالک کا سفر کرنے کا اتفاق ہوا ان میں سے ہندوستان، عراق، شام، مصر اور افغانستان خاص طور پر قابل ذکر ہیں، بلکہ ان کی بعض تحریروں سے تو اس گمان کو بھی تقویت ملتی ہے کہ تقسیم ہند کے بعد کے ابتدائی چند سالوں کے دوران شاید وہ ہندوستان میں ایران کے ثقافتی قونصلر وغیرہ بھی رہے ہوں۔[۵]

استاد محیط طباطبائی جن کا شمار آنے والے سالوں کے دوران ایران کے چوٹی کے محققین میں ہوا،[۶] ستمبر ۱۹۳۴ء میں تہران میں جشن فردوسی کے انعقاد سے پہلے ہی حضرت علامہ اقبالؒ کے بعض فارسی آثار کو دیکھ چکے تھے۔ اس جشن کے دوران انہوں نے اپنا ایک مقالہ جو "عقیدۂ دینی فردوسی" کے زیر عنوان اُنہی دنوں شائع ہوا تھا، معروف افغان شاعر و ادیب اور جشن فردوسی میں شریک افغان مندوب سرور خانِ گویا اعتمادی کے ہاتھ، موصوف کی فرمائش پر، حضرت علامہ کی خدمت میں ارسال کیا۔ سرور خان گویا ۱۹۳۳ء میں حضرت علامہ کے سرکاری دورۂ افغانستان کے دوران علامہ کے افسر مہماندار کی حیثیت سے نہ صرف انہیں بہت نزدیک سے دیکھ چکے تھے،[۷] بلکہ دونوں کے درمیان محبت و وداد کا ایک ایسا اٹوٹ رشتہ بھی استوار ہو گیا تھا جو سرور خانِ گویا کی زندگی کے آخری ایام تک بدستور قائم رہا۔[۸] علامہ نے مذکورہ مقالے کی جو رسید سرور خانِ گویا کو ارسال کی، اس کے ہمراہ اسرار و رموز، زبور عجم، پیامِ مشرق، اور جاوید نامہ کا ایک ایک نسخہ بھی اپنے دستخطوں کے ساتھ سیّد محمد محیط طباطبائی کے لیے بھیجا۔ گویا نے اپنے نام حضرت علامہ کے انگریزی خط کی نقل اور یہ چاروں کتابیں بذریعہ ڈاک محیط طباطبائی کے لیے کابل سے تہران بھجوا دیں اور اس طرح موصوف کو اپنے بارے میں حضرت علامہ کے نیک جذبات اور حسنِ ظن کا بخوبی اندازہ ہوگیا۔

حضرت علامہ اقبالؒ کی زندگی میں جس ایرانی نے سب سے پہلے فارسی زبان میں ان کی شخصیت اور فن کے بارے میں فارسی میں کوئی مقالہ لکھا وہ سیّد محمد علی داعی الاسلام تھے،[۹] اور حضرت

سالوں میں انہوں نے کم از کم چار اور مقالے اقبالؒ کے بارے میں ایرانی مجلّات میں شائع کیے، لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جاوید نامہ کو انہوں نے پہلی مرتبہ جس سرسری انداز سے دیکھا اسے اگر سرد مہری سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

سیّد محمد محیط طباطبائی نے اس کتاب پر اظہار خیال کے لیے جو لب و لہجہ اپنایا اور جس پیرائے کا انتخاب کیا اسے معروف ضرب المثل ''اسب پیشکشی را در دہان نگاہ کردن''(۱۱) کا مصداق تو کہا جا سکتا تھا، لیکن اس میں معمول کے ایرانی تکلفات کی دور دور تک کہیں خبر نہ تھی۔ موصوف نے اس رویے سے حضرت علامہ کے ان خدشات کی بھی تائید ہوئی جو ہندی فارسی کے حوالے سے ان کے ذہن میں اپنے ایرانی قارئین کے تحفظات کے بارے میں عمومی طور پر موجود تھے، اور جن کا اظہار انہوں نے ۲۰/جنوری ۱۹۳۱ء کو ڈاکٹر ناموس کے نام اپنے ایک خط میں کیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ناموس نے ظاہراً علامہ سے اپنے کسی ایرانی دوست کی خاطر، ان کے بعض فارسی آثار کی فرمائش کی تھی، جس کے جواب میں حضرت علامہ نے لکھا:

> باقی رہے منظومات، تو [اصل: سو] یہ ہندی فارسی ہے، ایک ایرانی کو کیا پسند آئے گی۔ میرے زیر نظر حقائق اخلاقی و ملی ہیں۔ زبان میرے لیے ثانوی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ فن شعر سے بھی میں بحیثیت فن نابلد ہوں۔ اگر ان خیالات کو کوئی شخص ان کی [اہل ایران کی] مروجہ زبان میں لکھ دے تو شاید ان لوگوں کے لیے مفید ہو۔ بہرحال جو کچھ شائع ہو چکا ہے، حاضر کر دیا جائے گا۔(۱۲)

سیّد محمد محیط طباطبائی کو یقیناً اس بات کا علم نہیں تھا کہ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۱ء کے اواخر تک کے عرصہ کے دوران جاوید نامہ کو اپنی ''زندگی کا ماحصل''(۱۳) بنانے کی خاطر حضرت علامہ کو کس قدر مشقت کرنا پڑی تھی، اور انہوں نے اس سلسلے میں کیا کیا پاپڑ بیلے تھے۔(۱۴) یہی وجہ ہے کہ اس کی تکمیل کے بعد ان کے دل و دماغ ان کے اپنے الفاظ میں ''نُچڑ گئے تھے''(۱۵) اور بقول ڈاکٹر جاوید اقبالؒ کے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے لیے اب ''وقتی طور پر نہ فارسی میں کچھ کہہ سکنا ممکن تھا، اور نہ اُردو میں۔''(۱۶)

جس طرح پیامِ مشرق گوئٹے کے دیوان غربی کا جواب دینے کے لیے اقبالؒ کی جانب سے

> ہے۔ اِس تصنیف میں دور حاضر کے تمام جماعتی، اقتصادی، سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور اصلاحی مسائل زیرِ بحث آ گئے ہیں۔[۱۷]

اسی لیے حضرت علامہ کی انتہائی خواہش تھی کہ اس کتاب کا کسی طرح ''تمام و کمال'' کسی یورپی زبان میں ترجمہ ہو جائے۔ چنانچہ آپ ۳۱/مارچ ۱۹۳۳ء کے ایک خط میں ڈاکٹر صوفی غلام محی الدین کو لکھتے ہیں:

> اس سے زیادہ اہم کام یہ ہے کہ جاوید نامہ کا تمام و کمال ترجمہ کیا جائے۔ یہ نظم ایک قسم کی Divine Comedy ہے۔ مترجم کا اس سے یورپ میں شہرت حاصل کر لینا یقینی امر ہے۔ اگر وہ ترجمہ میں کامیاب ہو جائے، اور اگر اس ترجمہ کو کوئی عمدہ مصور Illustrate بھی کر دے تو یورپ اور ایشیا میں مقبول تر ہوگا۔ اس کتاب میں بعض بالکل نئے تخیلات ہیں اور مصور کے لیے بہت عمدہ مسالہ ہے۔[۱۸]

چنانچہ اس کتاب کی مصوری کے لیے حضرت علامہ نے جن فنکاروں سے خط و کتابت کی یا مذاکرات انجام دیے ان میں سے عبدالرحمٰن چغتائی[۱۹] اور کاظمی[۲۰] نام کے آرٹسٹ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

علامہ اقبالؒ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن تشریف لے گئے تو وہاں مولانا شوکت علی[۲۱] کی برکت سے ان کی جن ممتاز شخصیات سے ملاقاتیں ہوئیں ان میں ایران کے ایک سابق وزیرِاعظم سیّد ضیاء الدین طباطبائی بھی شامل تھے جو گزشتہ کوئی نو ایک برس سے ایران سے باہر تھے اور اس وقت سوئٹزرلینڈ میں زندگی گزار رہے تھے اور اب چند دنوں کے لیے لندن آئے ہوئے تھے۔ بقول مولانا مہر کے وہ نو زبانیں جانتے تھے اور معاملاتِ دنیا پر ان کی ''نہایت اچھی نظر'' تھی۔[۲۲] سیّد ضیاء الدین نے ایک دن مولانا شوکت علی، مولانا زاہد علی، حضرت علامہ اقبالؒ، مولانا شفیع داؤدی اور مولانا مہر کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا جس کے بعد کوئی دو ایک گھنٹے تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اسی دوران میں حضرت علامہ نے جاوید نامہ کے بعض شعر بھی حاضرین کو سنائے جنہیں سن کر مولانا مہر ہی کے بقول ''سیّد صاحب تڑپ اُٹھے اور اپنے رفقا سے کہنے لگے کہ ایسی چیزیں آج تک نہیں سنیں۔ ضروری ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے کلام کو ایران میں بکثرت شائع کیا [illegible]''[۲۳]

نے حضرت علامہ کو اس کے متعلق بہت اچھے خطوط لکھے،(۲۵) وہاں جرمنی کی ارلانگن(۲۶) یونیورسٹی کے پروفیسر ہل نے اس کے جرمن زبان میں ترجمہ کرنے کا عندیہ ظاہر کر کے(۲۷) اقبالؒ کی بے پایاں محنت اور اعلیٰ نبوغ کی قدردانی کی۔

مختصر یہ کہ حضرت علامہ کی وفات کے ربع صدی کے اندر اندر جاوید نامہ کے اطالوی،(۲۸) جرمن (منظوم)،(۲۹) فرانسیسی(۳۰) اور انگریزی(۳۱) زبانوں میں تراجم منظرِ عام پر آچکے تھے اور اس طرح بقول معروف برطانوی مستشرق پروفیسر اے-جے-آبری(۳۲) کے جنھوں نے خود بھی یونیسکو کی فرمائش پر اس کتاب کا منظوم انگریزی ترجمہ کیا اور اس سے قبل اقبالؒ کے بعض دیگر آثار کو بھی انگریزی نظم کا جامہ پہنا چکے تھے،(۳۳) ''اِن تراجم کی بدولت یہ نظم نہ صرف ساری دنیا کے قارئین کی دسترس میں آگئی بلکہ اسے بین الاقوامی سطح کے کلاسیکی ادب میں بھی اپنا جائز مقام حاصل ہوگیا''۔(۳۴)

بہرحال استاد سیّد محمد محیط طباطبائی کے زیرنظر مقالے میں(۳۵) اقبالؒ اور جاوید نامہ کے حوالے سے جو باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان میں سب سے پہلے تو حضرت علامہ کی جشنِ فردوسی میں عدم موجودگی پر ایرانی باریک بینوں کا اظہار استعجاب ہے،(۳۶) لیکن اس وقت چونکہ ہم استاد محیط طباطبائی کے جاوید نامہ پر تبصرے کے حوالے سے بات کر رہے ہیں، اس موضوع کو کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

استاد محیط طباطبائی کے بقول جاوید نامہ میں حلاج سے منسوب غزل:

زخاک خویش طلب آتشی کہ پیدا نیست
تجلّی دگری در خورِ تقاضا نیست!(۳۷)

برصغیر میں مطبوعہ مجعول دیوان حلاج سے منقول ہے۔(۳۸) اس میں شبہ نہیں کہ برصغیر میں حلاج سے منسوب ایک جعلی فارسی دیوان ایک زمانے میں چھپا تھا،(۳۹) لیکن جاوید نامہ میں حلاج کی زبان میں جو غزل ادا کی گئی ہے وہ درحقیقت اقبالؒ کی اپنی ہی ایک پرانی غزل ہے جو اس سے قبل پیامِ مشرق میں بھی شائع ہو چکی تھی۔(۴۰) البتہ جاوید نامہ میں اسے شامل کرتے وقت اقبالؒ نے اس کا چھٹا اور دسواں شعر حذف کر دیے اور باقی اشعار کی ترتیب بھی بدل دی۔(۴۱) اس سلسلے میں دوسری اہم بات

ر تضمین کیا ہے:

بملکِ جم ندہم مصرعِ نظیری را
''کسی کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست''(۴۲)

لیا دیوانِ حلاج میں، وہ جعلی ہی کیوں نہ ہو، نظیری کے کسی شعر یا مصرعہ کے تضمین کیے جانے کا کوئی رکان ہو سکتا ہے؟

تیسری بات یہ کہ قرۃ العین طاہرہ زرین تاج اور غالب کی غزلیات کے برعکس جو الٹے کاموں کے درمیان نقل ہوئی ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اقبالؒ کی سوچ کے مطابق، یہ ان شعرا کی پنی غزلیں تھیں۔ حلاج والی غزل جو دراصل اقبالؒ کی ہے، لیکن حلاج کی ترجمانی کرتی ہے، الٹے کاموں کے بغیر نقل ہوئی ہے۔ اس سے نقلِ مطالب میں حضرت علامہ کی احتیاط پسندی کی بڑی واضح ور پر غمازی ہوتی ہے جس کا وہ اپنے شعری آثار کے دوران طباعت خاص خیال رکھتے تھے۔(۴۳)

جہاں تک طاہرہ سے منسوب غزل:

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ، روبرو
شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ، مو بہ مو

کا تعلق ہے، وہ، جیسا کہ استاد محیط طباطبائی کی تحقیق سے ظاہر ہے یقیناً طاہرہ کی نہیں، بلکہ اس کے پیشرو شعرا میرزا محمد طاہر وحید قزوینی (م۱۱۲۰ھ / ۸-۱۷۰۷ء)(۴۴) یا شاہ طاہر داعی انجدانی کاشانی (م۹۵۲ھ / ۴۵-۱۵۴۴ء)(۴۵) میں سے کسی ایک کی ہے، لیکن یہاں جو بات فراموش نہیں کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ حضرت علامہ فارسی ادب کی کوئی تاریخ مرتب نہیں کر رہے تھے اور نہ ان کا منشا کسی تاریخی روئیداد کو قلمبند کرنا تھا، بلکہ وہ اپنی ایک ذہنی تخلیق اور خیالی سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات کو بیان کرنا چاہتے تھے جس میں اکثر جگہوں پر مختلف شخصیات سے جو کچھ کہلوایا گیا ہے وہ زیادہ تر اقبالؒ ہی کی زبان میں ادا ہوا ہے؛ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جو کچھ یہ کردار کہتے نظر آتے ہیں، اس میں اور ان کی معروف طور پر جو سوچ اقبالؒ کے دور تک پہنچی تھی، یا خود اقبالؒ کے نزدیک ان کی جو سوچ تھی، یا ہو سکتی تھی، دونوں میں ایک گونہ مماثلت ضرور موجود ہے۔ غرض یہ کہ اگر طاہرہ سے

ابلیس کے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے بھی تو اشعار کہے گئے ہیں۔ ابلیس سے منسوب تو کوئی دیوان دنیا میں موجود نہیں ہے!

یہ سب چیزیں اپنی جگہ، استاد سیّد محمد محیط طباطبائی کو جاوید نامہ میں اقبالؒ کی جو بات ظاہراً سب سے زیادہ کھٹکتی نظر آتی ہے وہ اس نظم میں قرۃ العین طاہرہ[۴۶] کا ذکر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ خدانخواستہ اقبالؒ کو بابی یا بہائی تحریک سے جس کی طاہرہ ایک اہم رکن تھی، کسی قسم کی کوئی ہمدردی تھی، یا وہ ان تحریکوں کے پس پردہ عوامل، یا اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کے لیے ان کے خطرناک عواقب سے کسی طرح بے خبر تھے۔ ان تحریکوں کے بارے میں ذاتی مطالعہ و مشاہدہ کے علاوہ، اقبالؒ کے براؤن جیسی اہم شخصیت کے ساتھ جس نے ان تحریکوں کو نہ صرف مغرب میں روشناس کرایا بلکہ ان کے حق میں سازگار فضا پیدا کرنے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا،[۴۷] سالہا سال پر محیط ذاتی روابط[۴۸] کی بدولت ان تحریکوں اور ان کے مرکزی کرداروں کے بارے میں شاید ہی کوئی ایسا مخفی گوشہ ہو، جہاں تک اقبالؒ کی حقیقت بیں اور خاراشگاف نگاہیں نہ پہنچ سکی ہوں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان تحریکوں کے منفی پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں جس تندہی اور تسلسل کی روایت ہمیں اقبالؒ کے ہاں نظر آتی ہے[۴۹] اس کا اس سطح کا کوئی مثیل شاید خود ایران میں بھی بآسانی دستیاب نہ ہوسکے۔ ایسے میں ان تحریکوں سے اسلامی تہذیب و تمدن کو درپیش خطرات پر اقبالؒ کے حوالے سے کسی قسم کی رائے زنی نہ صرف غیرضروری، بلکہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف محسوس ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں اگر طاہرہ پر (کشف حجاب کی وجہ سے)[۵۰] انگشت نمائی جائز ہے تو حسین بن منصور حلاج کون سے 'بے جرم و خطا' اور 'بلا جوازِ شرعی' کے تختۂ دار کی زینت بنے تھے؟[۵۱] رہا غالب بیچارہ، تو وہ اپنے 'بادہ خواری' کا خود اقرار کرتا ہے:

یہ مسائل تصوّف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اور اگر یہ سلسلہ چل نکلے تو کیا بعید کہ کل کلاں کو بعض حلقوں کی طرف سے جاوید نامہ میں اور کرداروں کی موجودگی بشمول سیّد جمال الدین افغانی کے، جن کے احوال و آثار و خدمات کو اجاگر کرنے میں استادِ مرحوم سیّد محمد محیط طباطبائی کی حیاتِ علمی کا ایک وقیع حصہ صرف ہوا،[۵۲] بوجوہ محلِ

سے کون بیان کر سکتا ہے؟ مثال کے طور پر، پیامِ مشرق میں 'دخترانِ ملت' کو وہ اس طرح خطاب کرتے ہیں:

ضمیرِ عصر حاضر بی نقاب است — کشادش در نمودِ رنگ و آب است
جہانتابی ز نورِ حق بیاموز — کہ او با صد تجلی در حجاب است(۵۴)

یک اور جگہ فرماتے ہیں:

اگر پندی ز درویشی پذیری — ہزار اُمّت بمیرد، تو نہ میری
بتولؓ باش و پنہان شو ازین عصر — کہ در آغوش شبیری بگیری(۵۵)

اقبالؒ کی نگاہ میں حلاج، طاہرہ، اور غالب کی شخصیات کس مقام کی حامل ہیں اور کیوں، اس بات کا اندازہ فلک مشتری کی روئیداد کی تمہید کے عنوان اور مندرجات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ تمہید کے عنوان میں انہیں ''ارواحِ جلیلہ'' کے لقب سے یاد کیا گیا ہے جو گردشِ جاوداں کو بہشتی نشیمن پر ترجیح دیتی ہیں۔ یہ ''پاکباز ارواح'' جو ہنگامِ الست ہی سے حالت تب و تاب اور بے قراری میں بسر کر رہی ہیں، اپنے نغمات کی شراب سے سراپا مدہوش و سرمست ہیں، اور ان کے چہروں کی تابناکی ان کے صفائے باطن اور سوزِ دروں کی غماز ہے۔ سفر کے اس مرحلے پر اقبالؒ کا رہبر- رومیؒ -ان ارواح کے شوقِ بے پروا، عشق و سرمستی اور شعلہ نوائی کی طرف اسے بقول اقبالؒ بدیں الفاظ متوجہ کرتا ہے:

گفت رومی ''این قدر از خود مرو — از دمِ آتش نوایان زندہ شو!
شوق بے پروا ندیدستی، نگر! — زور این صہبا ندیدستی، نگر!
غالب و حلاج و خاتونِ عجم — شورہا افگندہ در جانِ حرم!
این نواہا روح را بخشد ثبات
گرمیِ او از درونِ کائنات!''(۵۶)

خلاصہ یہ کہ رومی سے منسوب ان شخصیات پر تبصرے کی بدولت ان کی عظمت کے بارے میں اقبالؒ کے متذکرہ بالا تاثر کو اور بھی چار چاند لگ جاتے ہیں۔

کی لازوال علامتیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ موخرالذکر کو براؤن بار بار ''بابی ہیروئن'' کے لقب سے یاد کرتا ہے۔(۵۷) دونوں نے جس قسم کے ناگفتہ بہ اور صبرآزما حالات میں جس استقلال، ہمت اور جوانمردی سے جان شیریں جان آفریں کے سپرد کی اس سے اپنے اور بیگانے دونوں ہی عش عش کر اٹھے لیکن ان کی بلند حوصلگی کی داد دیجیے کہ ان سب چیزوں کے باوجود ان کی اس صدائے حسرت کی بازگشت آج بھی اہل درد کے کانوں میں بدستور گونج رہی ہے کہ:

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جبکہ غالب اپنی انقلاب پسندی اور نادرہ کاری کی وجہ سے اقبالؒ کی توجہ کا مرکز قرار پایا، چونکہ اس کا اپنا عقیدہ یہ ہے:

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش — براہِ دیگران رفتن عذاب است
اگر از دستِ تو کارِ نادر آید — گناہی ہم اگر باشد ثواب است(۵۸)

اور یہ وصف ایک اعتبار سے ان تینوں شخصیات میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔(۵۹)

یہاں اس بات کی وضاحت بھی بے جا نہ ہوگی کہ شیخ احمد احسائی (۱۷۵۳-۱۸۲۴ء / ۱۱۶۶-۱۲۴۱ھ) اور ان کے بعد ان کے نائب مناب اور شاگرد خاص سید کاظم رشتی کے پیرو بانیِ سلسلہ کے نام کی مناسبت سے شیخی کہلاتے ہیں اور ان کا سلسلہ شیخیہ کے نام سے معروف ہے۔ یہ دونوں ایک اعتبار سے ''باب'' کے پیشرو تھے، چونکہ ان کی تحریروں میں اس بات کے اشارے موجود تھے کہ امام قائم کا ظہور ہونے والا ہے۔ علی محمد ''باب''، قرۃ العین طاہرہ، اور ملاحسین بشرویہ کا شمار موخرالذکر ہی کے دامن تربیت کے وابستگان میں ہوتا ہے۔ ان میں سے ''باب'' نے بالآخر بانیِ مذہب ہونے کا اعلان کر دیا اور ملاحسین بشرویہ ۱۸۶۰ء میں اس پر سب سے پہلے ایمان لے آئے۔ بعد میں اس صف میں طاہرہ بھی شامل ہوگئی۔ اس طرح سب سے پہلے جو اٹھارہ افراد بابیت کے دائرے میں شامل ہوئے وہ ''حروفات الحی'' (چونکہ ابجد کے حساب سے ''حی'' کے اعداد اٹھارہ ہوتے ہیں) کے مرموز نام سے پہچانے گئے۔

ملا حسین بشرویہ، طاہرہ زرین تاج، ملا محمد علی ماژندرانی بار فروشی (قدوس) اور ملا حسین علی نوری وغیرہ نے (جو بعد میں بہاء اللہ کے لقب سے معروف ہوئے اور بہائی مذہب کے بانی قرار پائے) بدشت ماژندران میں ایک عظیم جلسے کا اہتمام کیا جس کے اہداف میں باب کی رہائی، نئے مذہب کا کھلم کھلا اعلان، بابی کشی کا سدباب اور بابی مذہب کے پیروؤں کی قوت ایمانی کی تقویت کا سامان کرنا شامل تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہ عوامی حمایت سے لیس ہو کر پُرامن طریقے سے ماکو کی طرف جا کر باب کو رہا کرانے کی کوشش کریں گے اور اگر راستے میں ان پر زیادہ تشدد کیا گیا تو وہ روس میں پناہ لے لیں گے۔

طاہرہ کا اصرار تھا کہ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر نئے مذہب کا جلد از جلد اعلان کرنا ضروری ہے جبکہ قدوس کی رائے یہ تھی کہ باب کے اب تک کے پیرو زیادہ تر مومن قسم کے سادہ لوح مسلمان ہی ہیں۔ اس کی اصل حقیقت کے بارے میں ان کی ''غلط فہمی'' کو ابھی دور کرنے کا وقت نہیں آیا۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس سے بہت سی مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں، لیکن طاہرہ اپنی بات پر اڑی رہی حالانکہ اس کے سب ساتھی اس بات پر متفق تھے کہ جونہی قرآن کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکالا گیا لوگ نیا مذہب قبول کرنے کے بجائے اس کے پیروؤں پر لعن طعن شروع کر دیں گے۔ اس پر طاہرہ کا استدلال یہ تھا کہ میں ایک عورت ہوں، اور سنت یہ ہے کہ اگر کوئی عورت مرتد ہو جائے، اور پھر تائب ہو جائے تو اسے معاف کر دیا جاتا ہے۔ اندریں حالات مناسب یہ ہوگا کہ قدوس مجھ سے دور رہیں اور میں دوران تقریر نئے مذہب کے حقائق کا برملا اعلان کر دوں۔ اگر حالات بگڑ گئے اور لوگوں نے میرے خلاف قدوس سے شکایت کی، تو وہ مجھے کافر قرار دے دیں اور دوبارہ دائرۂ اسلام میں شامل ہونے کی نصیحت کریں۔ چنانچہ سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ بالآخر ایک دن چونکہ حقیقت نے بے نقاب ہونا ہی ہے تو کیوں نہ یہ کام جلد از جلد انجام پا جائے۔ چنانچہ اس منصوبے کے مطابق طاہرہ نے حسب معمول ایک باریک پردے کی اوٹ سے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ عین اس وقت جب وہ یہ اعلان کر رہی تھی کہ ''خداوند کا ظہور ہو چکا ہے، اور ہمارے لیے آسمان سے ایک نئی کتاب نازل ہو چکی ہے جس میں ہمارے لیے نئے قوانین مقرر کیے گئے ہیں''، ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت خدام نے پردے کی طنابیں دونوں طرف سے کاٹ دیں، اور اب طاہرہ اپنے تمام تر شکوہ و جلال کے ساتھ حاضرین کے سامنے موجود تھی۔

ہوں۔ کیا میں آپ لوگوں کی بہن نہیں ہوں؟ اور کیا آپ میرے بھائی نہیں؟ آخر ایسی کون سی بہن ہے جو اپنے بھائیوں سے اپنا چہرہ چھپاتی ہو؟ لیکن اس غیر متوقع واقعہ سے حاضرین پر گویا ایک بجلی سی آن گری تھی۔ بعض لوگوں نے اپنے چہروں کو دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور بعض نے اپنے لباس کے دامن اپنے سروں پر اوڑھ لیے تاکہ ان کی نظریں ایک نامحرم خاتون کے چہرے پر نہ پڑیں، لیکن ان ساری باتوں کے باوجود طاہرہ نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا: ''میرے بھائیو! پردہ کے بارے میں پرانے احکام موقوف ہو چکے ہیں۔'' بہرحال وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکی اور بہت ہی کم لوگ تھے جنہوں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ ایسے میں میرزا حسین علی نوری (بہاء اللہ) نے جب دیکھا کہ معاملہ طول پکڑ رہا ہے اور نوبت خونریزی تک نہ پہنچ جائے تو انہوں نے اپنی عبا طاہرہ کے سر پر ڈال دی اور اسے خیمہ کے اندر لے گئے۔ چنانچہ یہ اجتماع اس اعتراض اور احتجاج پر اختتام پذیر ہوا کہ اس خاتون نے مذہبی قوانین کو پس پشت ڈال کر اس طرح اپنے آپ کو غیر مردوں کے سامنے کیوں ظاہر کیا؟ کچھ کا خیال تھا کہ اسے اچانک جنون کا دورہ پڑ گیا تھا جبکہ بعض نے اس کی اس حرکت کو اس کی حماقت سے تعبیر کیا۔[۶۰] درمیان میں کچھ حاضرین ایسے بھی تھے جو اس کی اس دلیری کی داد دے رہے تھے۔ غرضیکہ بابی تاریخ کے تناظر میں ''کشفِ حجاب'' سے یہی واقعہ مراد ہے۔

یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علامہ جہاں اہلِ ایران کے بابی تحریک کے خلاف ابتدائی ردِعمل کو ایک منطقی بات سمجھتے تھے[۶۱] وہاں انہیں طاہرہ یا اس قبیل کے دیگر بابی یا بہائی انتہا پسند افراد کے اعمال پر شاید اس لیے بھی کوئی اعتراض نہ تھا کہ وہ ان کے نزدیک اپنے آپ کو ایک الگ مذہب کے پیرو تسلیم کر چکے تھے اور اب ان کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔[۶۲]

آیئے اب اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر دیکھیں کہ استاد سیّد محمد محیط طباطبائی جاوید نامۂ اقبالؒ کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور کیوں!

وہ خط جو اقبالؒ کو بھیجا نہ جا سکا۔[۶۳]

آج سے تنتالیس برس قبل[۶۴] تہران میں 'جشنِ ہزارۂ فردوسی' کے موقع پر[۶۵] سرور خان

''عقیدۂ دینی فردوسی'' جو مجلۂ مہر کے خصوصی فردوسی نمبر میں شامل تھا اور اس کے علاوہ الگ سے بھی شائع ہو چکا تھا، اقبالؒ کے لیے جن کی ایسی ادبی تقریب میں عدم موجودگی سب باریک بین طبائع پر گراں گزری تھی، آپ کے نام کی تحریر و تقدیم کے ساتھ گویا ہی کے ہاتھ لاہور ارسال کیا تھا۔ یہ ۱۳۱۴(شمسی) کے موسم خزاں کی بات ہے کہ گویا کے نام اقبالؒ کے انگریزی زبان میں ایک خط کی نقل جس کے ہمراہ ان کے چار شعری مجموعے اسرار خودی و رموز بے خودی، زبور عجم، پیامِ مشرق، اور جاوید نامہ جو اقبالؒ کے دستخط سے مزین تھے، کابل کی ڈاک سے مجھے موصول ہوئی۔ میں اقبالؒ کی پہلی تین کتابیں تو اس سے پہلے ہی دیکھ اور پڑھ چکا تھا، لیکن جاوید نامہ غالبًا پہلی دفعہ میری نظر سے گزر رہا تھا۔ اس مثنوی کے مطالعے کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ اقبالؒ نے حسین منصور حلاج سے منسوب ایک فارسی دیوان کو، اور اسی طرح طاہرہ قزوینی سے منسوب اشعار کے مجموعے کو دیکھ کر کہ یہ دونوں ہندوستان سے شائع ہوئے اور اقبالؒ کی نظر سے گزرے تھے، اور اپنے ہم وطن، ہم مذہب اور ہم قرن شعرا میں سے غالبِ دہلوی کے مطبوعہ دیوانِ غزلیات میں سے، اس بات کا خیال کیے بغیر کہ حلاج کے نام سے منسوب دیوان جعلی ہے اور قرۃ العین طاہرہ قزوینی سے منسوب یہ دلنشین اشعار دوسروں کے ہیں، ان تین افراد کے اشعار میں سے تین غزلیں منتخب کر کے اپنے [آسمانی] سفر کے راستے میں فلکِ مشتری پر ان کے قیام کی خاطر، باوجود اس کے کہ ان کے زمین و آسمان پر کسی بھی جگہ اس طرح یکجا جمع ہونے کی کوئی جامع دلیل سمجھ میں نہیں آتی، ان کے لیے ایک بزم سجائی ہے جس میں ان تین غزلوں کو ان کی زبان سے ادا کرایا ہے، اور پھر ان کے اس باہمی اظہار خیال کو بنیاد بنا کر ان کے اور اپنی جہانگرد اور جہاں بین روح کے درمیان اپنے عرفانی ذوق، فکری استعداد اور سیر و سلوک سے اپنے ہدف کے تقاضوں کے مطابق تبادلۂ خیالات کا اہتمام کیا ہے جس کے لیے کسی مضبوط اور مرتبط بنیاد کا تلاش کرنا اور پانا دونوں محالات میں سے ہیں۔

۱۳۱۶ [شمسی] کے دوران جب مجھے سرکاری ملازمت سے وقتی طور پر ذرا فرصت نصیب ہوئی اور گھر پر بیٹھنے کا موقع ملا تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ اقبالؒ کی توجہ ان غزلیات کے منصورِ حلاج اور طاہرہ قرۃ العین کے ساتھ ضعفِ انتساب کی طرف مبذول کرا دوں اور اس سلسلے میں اپنے دلائل کا ایک خلاصہ لکھ کر ان کی خدمت میں ارسال کر دوں۔ اتفاق سے اُنہی دنوں اورنگ زیب کے بیٹے شہزادہ اکبر[(۲۶)] کے منشی اور ہمسفر جلال الدین محمود قادری کی ایک بیاض (جُنگ) میرے ہاتھ لگ گئی

اور اس عرصے میں مختلف مطالب اپنی بیاض میں بطور یادگار محفوظ کرتا رہا تھا۔ خوش قسمتی سے کچھ ہی عرصہ بعد یہ نسخہ مجلس شوریٰ ملی [تہران] کے کتب خانے میں منتقل ہو گیا اور حسنِ اتفاق سے یہ آج بھی وہاں کے ذخیرۂ مخطوطات میں محفوظ ہے۔

اس بیاض کا لکھنے والا کہ ایک لحاظ سے اس بیاض کا پہلا مالک بھی وہی تھا، شاعر محمد اقبالؒ کے قدیم ہم وطنوں میں سے تھا، جو مغل شہزادے اکبر کے ہمراہ بندر مسقط اور بندر عباس کے راستے اصفہان آیا تھا۔ شہزادہ اکبر اس سفر کے دوران جب قید و بند اور بندرگاہوں کے جھمیلوں اور موت کے خطرے سے نجات پانے کے بعد اصفہان میں وارد ہوا تو شاہ سلیمان نے اس کو خیر مقدم کہا اور اپنی حمایت کا یقین دلایا اور پھر شاہ سلطان حسین نے بھی اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھا۔ شہزادہ اکبر نے اس امید پر کہ شاید ایک دن وہ بھی اپنے جدّ [بزرگ] ہمایوں کی طرح شاہِ ایران کی مدد سے واپس ہندوستان جانے میں کامیاب ہو جائے گا، ایک عرصے تک فراہ، قندہار اور کابل جیسے سرحدی مقامات پر اپنی آمد و رفت اور تگ و دو کا سلسلہ جاری رکھا، لیکن بالآخر مشہد میں اقامت اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا اور ۱۱۲۰ ہجری [قمری](۶۷) کے لگ بھگ سرانجام وہیں فوت ہو کر پیوند خاک ہوا۔ اس بیاض کا مالک جس کی یادداشتیں اس کے اپنے ہاتھ میں ۱۱۱۷ ہجری تک سنین وار اس میں مندرج ہیں، اکبر کے بعد کس سرنوشت سے دوچار ہوا، اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ بیاض کے ایک ورق پر ندائی تخلص کے کسی شاعر کی ایک مختصر سی مثنوی بغداد میں ۱۱۲۵ ہجری میں وجیہ اللہ نامی کسی شخص کے ہاتھ سے نقل ہوئی ہے لیکن یہاں اس بیاض کے اصلی مالک یا کاتب کے بارے میں کوئی اشارہ موجود نہیں۔ یوں لگتا ہے کہ [اصلی مالک کے بعد] یہ بیاض کسی اور کی ملکیت میں چلی گئی اور پھر کسی طرح حدودِ ایران سے نکل کر بلاد عثمانی میں پہنچ گئی۔ مذکورہ بالا اسی ورق کی پشت پر جہاں اب کتاب خانۂ مجلس کا ۵۶۸ نمبر اس پر ثبت ہے، اس بیاض کے اصلی مالک کے خط میں، جس نے اس کے اکثر مطالب کو خود ہی لکھا تھا، طاہرہ قزوینی سے منسوب غزل:

گر بتو افتدم گذر چشم بہ چشم رو بہ رو
شرح کنم غمِ تورا نکتہ بہ نکتہ، مو بہ مو

جسے دیکھ کر اقبالؒ اس قدر متاثر ہوئے تھے، پر مبنی ایک مخمس نقل ہوئی ہے۔ اشعار والے کالم کے اوپر صاحبِ مخمس کا نام ''میرزا محمد طاہر'' اس طرح لکھا گیا ہے کہ ''طاہر'' کے بعد کے مٹے ہوئے لفظ کا

شاہ عباس دوم سے لے کر شاہ سلطان حسین کے ابتدائی دور تک صفوی دربار سے بطورِ وقائع نگار، نامہ نویس، شاعر، اور ایک معروف وزیر کے وابستہ رہا۔ شہزادہ اکبر کی سفارش میں اسی میرزا محمد طاہر کے انشا کردہ امامِ مسقط اور خلیجِ فارس کی بندرگاہوں کے حکام کے نام شاہ سلیمان کے خط کی نقل طاہر وحید کے مجموعۂ منشآت میں موجود ہے۔ اس مجموعۂ منشآت کا ایک انتخاب قبل ازیں ہندوستان میں چھپ چکا ہے اور جنگ کے مالک کے اس قسم کے شخص کو اس زمانے میں جاننے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اس مخمس پر کوئی تاریخ مرقوم نہیں لیکن اس سے پہلے کے اوراق میں درج ''ذی قعدہ ۱۱۱۲'' کی تاریخ سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ صفحہ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی کتابت ہوا ہوگا، لیکن اس کی تاریخ تحریر کسی صورت میں بھی ۱۱۲۰ اور ۱۱۲۵ ہجری کے درمیانی عرصے کے بعد کی نہیں ہوسکتی۔

اس ''نیمہ ہندی'' بیاض سے استناد کرتے ہوئے جس کے مطالب کی کتابت کو قرۃ العین کی شہرت کے زمانے پر ڈیڑھ سو سال کا شرف تقدّم حاصل ہے، میں نے فرور دین ۱۱۱۷ [کذا] شمسی میں ایک تحریر مرتب کی کہ اس میں شعرِ منصوری جسے حلاج سے منسوب کیا گیا تھا، کے بارے میں مطالب کے اضافے کے بعد اسے اقبالؒ کی خدمت میں ارسال کروں گا، کہ اسی اثنا میں ان کی وفات کی افسوسناک خبر روئٹر نیوز ایجنسی کی وساطت سے بڑی تیزی سے پوری دنیا میں پھیل گئی۔ چنانچہ انہیں خط لکھنے اور مقالہ ارسال کرنے کا خیال ختم ہوگیا اور میں نے اردی بہشت ماہ ۱۳۱۷ شمسی میں ادبی مجلّے ارمغان(۶۸) میں مرحوم کے حالات زندگی اور شاعری کے بارے میں مقالے کی اشاعت ہی پر اکتفا کو مناسب سمجھا۔ اقبالؒ اور اس کی شاعری کے بارے میں فارسی زبان میں ایرانی مطبوعات میں اس وقت تک شائع ہونے والی شاید یہ پہلی تحریر تھی۔

وہ خط جو میں اقبالؒ کی زندگی میں انہیں ہندوستان ارسال نہ کر سکا اب ان کی چالیسویں برسی کی مناسبت سے جبکہ ایران، پاکستان اور بھارت میں [مختلف] تقریبات منعقد ہو رہی ہیں اور [طرح طرح کے] مطالب چھپ رہے ہیں، اس مجلّے کے قارئین کی نذر کرتا ہوں جن کے فارسی شعر و ادب کے ساتھ لگاؤ کی بدولت آج اقبالؒ بھی امیر خسرو، بیدل، اور غالب کی طرح ایک انتہائی قابلِ قدر اور بلند مقام پر فائز ہے۔

''طاہرای کاشی'' کے نام سے نقل کیا گیا تھا، لیکن معلوم نہیں اب یہ بیاض کہاں ہے۔ جہاں تک ''طاہرای کاشی'' کا تعلق ہے تو یہ وہی معروف شاہ طاہر داعی انجدانی ہیں جو ہندوستان کو ہجرت کرنے سے پیشتر کاشان میں رہ چکے تھے۔ باطنی طور پر انہیں ایران کے اسماعیلی شیعوں میں بڑی توقیر حاصل تھی اور اسی وجہ سے بالآخر انہیں کاشان کو خیرباد کہہ کر دکن میں پناہ لینا پڑی تھی۔ ہندوستان کے فارسی آثار میں طاہرا کو شاہ طاہر دکنی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ صفوی دور کی نظم و نثر پر مشتمل ایرانی اور ہندوستانی بیاضوں میں بیسیوں مکتوب، قصیدے اور غزلیں ان کے نام سے دستیاب ہیں جن میں یہ غزل بھی شامل ہے۔

شاہ طاہر دسویں صدی ہجری کے نصفِ اوّل کے مشہور شاعر اور عظیم انشاپرداز ہیں۔ ان کے جو اور اشعار بھی ہم تک پہنچے ہیں ان میں بھی ان کی شاعری اور سخن فہمی کی کافی استعداد دکھائی دیتی ہے۔ جاوید نامہ کے ملنے کے بعد جب یہ بات مجھے معلوم ہوئی اور میں یہ سمجھ گیا کہ یہ غلط فہمی قرۃ العین کے مجموعۂ اشعار میں اس غزل کی موجودگی کے باعث اقبالؒ کو پیش آئی ہے، تو میری کوشش یہ تھی کہ اس ماخذ سے استناد کرتے ہوئے جو اس سے قبل ان اشعار کے شاہ طاہر دکنی سے انتساب کے سلسلے میں میری نظر سے گزر چکا تھا، اور قدرتِ بیان وتعبیر کے حوالے سے جو فرق اس غزل اور طاہرہ سے منسوب دیگر اشعار میں موجود ہے، اس پر اپنی ناقدانہ تردید کا اظہار کروں لیکن باطنِ حقیقت موجود سند کے انضمام اور معروضی شہادت کو پیش کیے بغیر عرضِ مطلب کو مانع تھا۔ پہلی بیاض کے ہاتھ سے نکل جانے کے کچھ ہی عرصہ بعد اچانک مجھے ایک اور بیاض مل گئی جسے اورنگزیب کے بیٹے کے ہمراہیوں میں سے کسی نے اس کی ایران میں پناہ کے سالوں کے دوران اپنے ہاتھ سے لکھا تھا اور اس کے بعض صفحات میں ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۱۳، اور ۱۱۱۷ کے سنین کی رقوم دکھائی دیتی تھیں۔ اتفاق سے اس بیاض کے ایک صفحے پر [طاہرہ سے منسوب] مذکورہ غزل پر مبنی ایک مخمس میری نظر سے گزری جو ۱۱۲۵ یا ۱۱۳۰ ہجری سے پہلے اور ۱۱۱۲ ہجری کے بعد بیاض میں شامل ہوئی تھی اور اس کے لکھنے والے کا نام مخمس کے آغاز میں میرزا محمد طاہر اس انداز سے مرقوم تھا کہ اس کے بعد میں آنے والا لفظ کچھ اس طرح سے مٹا ہوا تھا کہ جو کچھ پڑھا جا سکتا تھا، وہ لفظِ ''وحید'' سے نزدیک ترین محسوس ہوتا تھا۔

جس زمانے میں شہزادہ اکبر نے ایران میں پناہ لی میرزا محمد طاہر وحید قزوینی اس دور کی

موجود نہ تھی، لیکن مجھے ان کے دیوان کا کوئی ایسا نسخہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا جس میں ان کے سارے آثار شامل ہوں۔ اس موخرالذکر بیاض کا مالک، جلال الدین محمود قادری ظاہراً میرزا طاہر وحید کو نزدیک سے جانتا تھا اور بعید نہیں کہ اصفہان میں قیام کے دوران موصوف سے مل بھی چکا ہو۔ بنا بر ایں، ایسے اشعار جن پر مبنی مخمس گیارہ سو کچھ میں کسی بیاض میں ثبت ہو چکی ہو، انہیں کسی ایسے شاعر سے منسوب نہیں کیا جا سکتا جس نے اس تحریر سے ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصے کے بعد قزوین میں آنکھ کھولی ہو۔

زرّین تاج قزوینی کا شمار شیخیہ سلسلہ کے پیشوا سیّد کاظم رشتی کے عقیدت مندوں میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے شہر اور شوہر کو خیرباد کہہ کر عتبات میں سیّد کاظم رشتی کی خدمت میں چلی گئی تھی، جس نے اسے قرۃ العین کے لقب سے نوازا۔ سیّد کاظم رشتی کی وفات کے بعد جب اس کے ساتھی دو دھڑوں میں بٹ گئے تو زرین تاج نے سیّد علی محمد شیرازی اور ملا حسین بشرویہ ای کا ساتھ دیا جو اپنے آپ کو ''باب'' اور ''باب الباب ظہور قائم آلِ محمدؐ'' کہتے تھے۔ اس کی عتبات سے قزوین واپسی پر شیخیہ سلسلہ میں اس کے مریدوں نے اس کے چچا کو جو شیخیہ سلسلے کا دشمن تھا، قتل کر دیا۔ چنانچہ اپنے چچا کے قتل کے عواقب سے بچنے کی خاطر زرین تاج کو قزوین چھوڑنا پڑا اور اس نے تہران آ کر میرزا حسین علی نوری کے گھر پر پناہ لے لی۔ اس کے بعد جب وہ اپنے قزوینی عقیدت مندوں اور نوری کی معیت میں خراسان میں مقیم ملا محمد علی مازندرانی کی ملاقات کے لیے، جو قدوس کے نام سے معروف اور قائمیتِ موعود باب کا مدعی تھا، ہزار جریب مازندران کے مقام پر پہنچی، اور وہاں ملا محمد علی کی مرضی اور میرزا حسین علی کے مشورے سے جو اوّل الذکر کی جانب سے ''بہا'' کا لقب پا چکا تھا، ''رفعِ حدودِ دینی'' کا حادثہ بدشت میں رونما ہوا تو شیخیہ سلسلے کے بابیوں نے قرۃ العین کی جانب سے بدشت مازندران میں رضامندانہ طور پر اس پردہ دری میں شرکت کی وجہ سے اس پر انگشت نمائی کی اور باب الباب نے اس فتنے کو فرو کرنے کی غرض سے وعدہ کیا کہ وہ اہلِ بدشت کو ان کے اس ناروا عمل کے باعث کیفرِ شرعی تک پہنچائے بغیر دم نہیں لے گا۔ اس حادثے کے اثر کو زائل کرنے کے لیے قرۃ العین کو طاہرہ کے لقب سے نوازا گیا تا کہ وہ اپنے آپ کو بے گناہ ظاہر کر سکے۔ بنا بر ایں، اقبالؒ کو فلکِ مشتری پر جس شے کی تلاش تھی اس میں، اور اس بات میں جو طاہرہ قزوینی کے دین و دنیا کے حوالے سے تاریخِ بابیہ میں ثبت ہوئی ہے، ایک غیرمعمولی فرق دکھائی دیتا ہے۔

پیش نظر کس قدر جائز تھیں، یا نہیں، کسی دوسرے شاعر کے اشعار کا انتساب جو ہمارے شاعر سے تین سو سال پہلے گزر چکا ہے، اور جنہیں ایک ہندوستانی مصنف قرۃ العین کی پیدائش سے ایک صدی پہلے اپنی بیاض میں نقل کر کے یادگار کے طور پر چھوڑ گیا ہو، ایک بالکل نامناسب اور ناروا عمل ہے۔ اب اس خیال سے کہ مذکورہ مخمس کے پورے متن کو بمع اس کی بنیاد اصل غزل کے جس میں تخلص ''طاہرا'' استعمال ہوا ہے [برخلاف جاوید نامہ میں صفحہ ۱۳۸، پر منقول ''طاہرہ'' کے] سب محققین دیکھ اور پرکھ سکیں، ہم مذکورہ بیاض سے اسے نقل کر رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

میرزا محمد طاہر و -ید-

ساقی عشقت ای صنم زہر ستم سبو سبو
ریخت بہ ساغر دلم با می غم کدو کدو
چند دوم من از پیت گوشہ بہ گوشہ سو بہ سو
گر بتو افتدم نظر چشم بہ چشم رو بہ رو
شرح دہم غمِ ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو

تابہ رہِ محبتت پای طلب نہادہ ام
بررخِ دل درِ الم از ستمت گشادہ ام
تاقدمم بہ سر نہی، خاک نشین چو جادہ ام
از پیِ دیدنِ رخت ہمچو صبا افتادہ ام
خانہ بہ خانہ، در بہ در، کوچہ بہ کوچہ، کو بہ کو

در عقب تو جانِ من ہست چو سایہ ات روان
بستہ بہ زلف و گیسوت رشتۂ جانِ عاشقان
از چو توئی گسستنِ مہر و وفا نمیتوان
مہرِ ترا دل حزین بافتہ بر قماشِ جان
رشتہ بہ رشتہ، نخ بہ نخ، تار بہ تار، پو بہ پو

بار جدائی ترا بر دل و جان کشیدہ ام
ہمچو کمان حلقہ از بارِ ستم خمیدہ ام

ریخت بنفشہ بر رخ و صورتِ یاسمین، خطت
یا کہ فکندہ سایہ بر زہرۂ مہ جبین، خطت
خون شد نافہ را جگر، تاشدہ چین بہ چین، خطت
دادہ دہان و چہرہ و عارض عنبرین، خطت
غنچہ بہ غنچہ، گل بہ گل، لالہ بہ لالہ، بو بہ بو

درغمت از جگر فغان، آہ زدل بر آیدم
گیسو حلقہ حلقہ ات دامِ بلا نمایدم
لحظہ بہ لحظہ، دم بہ دم، خون ز دو دیدہ زایدم
از رخ و زلف و چشم و قد، ای مہِ من فزایدم
مہر بہ مہر، دل بہ دل، طبع بہ طبع و خو بہ خو

تاشدہ استخوانِ من با سگِ کویت آشنا
ماندہ بہ زیر بالِ غم گردنِ مطلب ہما
محض وفا توئی مرا غیر تو نیست مدعا
در دل خویش طاہرا گشت و ندید جز ترا
صفحہ بہ صفحہ، سَر بہ سَر، پردہ بہ پردہ، تو بہ تو

زیربحث غزل کی اس روایت میں قرۃ العین کے مجموعہ اشعار میں مندرج ابیات کی تعداد سے دو شعر زیادہ ہیں اور ادبی چوروں نے چونکہ انہیں غزل کے دیگر پانچ ابیات کا ہم پلہ نہیں جانا ان سے صرفِ نظر کر لیا۔ اسی طرح انہوں نے مقطع میں بھی ''طاہرا'' کو جو مصراع کے آخر میں واقع لفظ ''ترا'' سے ہم قافیہ تھا، لفظ ''طاہرہ'' سے بدل دیا، حالانکہ اس سے شعر کی خوبصورتی مجروح ہوتی ہے، تاکہ اپنی منظور نظر شخصیت کے نام کو اس میں جاگزیں کر سکیں۔

اسی طرح اس روایت کے مطابق پہلے شعر میں مذکور ''چشم بہ چشم'' کو ''چہرہ بہ چہرہ'' اور ''شرح کنم'' کو شرح دہم'' سے بدل دیا ہے تاکہ اسے موجودہ دور کی تعبیر سے ہم آہنگ کیا جا سکے۔ اسلام کا عظیم شاعر [اقبال] اپنے تمام تر حسنِ نیت اور صحتِ عمل کے باوجود ان چالوں اور سازشوں سے جو مختلف اشخاص، افکار و عقائد، چہروں، دھڑوں اور فرقوں کو ملمع کاری کے ذریعے حق بجانب

مجہول شخصیت کو جس کی حقیقت اور مقام سب پر آشکار ہے راز و نیاز کے لیے فلک مشتری پر لے جاتا ہے اور اس سلسلے میں اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ اس نے غیر شائستہ افراد اور نامناسب روایات پر اعتماد کر لیا جس کی وجہ سے آج اسے ایسی قابل اعتراض صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

آج سے چالیس سے کچھ سال اُوپر صرف اقبالؒ ہی سے ایسی غلطی سرزد نہیں ہوئی کہ اس نے اپنے نفس کے کہنے میں آ کر اپنی طبع رواں اور دلپذیر قلم کی زبان سے ایسی نکتہ چینی کے لائق بات ادا کر دی، بلکہ مجلس شورای ملّی [کے کتب خانے] میں موجود ہندوستانی بیاض جیسی سند کے ہوتے ہوئے جس کا تعارف بھی کرایا جا چکا ہے، معاصرین کی تحریر و تقریر میں یہ غرض آلود خطا پھر بھی کبھی نہ کبھی دیکھنے میں آ ہی جاتی ہے۔

اگر بعض معاصرین کسی غلط لفظ، معنی یا مفہوم ہی کی قبولیت پر اصرار کریں باوجود اس کے کہ وہ آزمائش اور امتحان کے مراحل سے گزر چکا ہو اور اس کی قابل قبول اور صحیح صورت بھی سب پر عیاں ہو چکی ہو تو ان کے اس رویے کے بارے میں مجموعی طور پر سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ مکتب کے بچوں کی طرح [حقیقت کا] منہ چڑا رہے ہیں۔

جی ہاں، جب کسی قوم کے بڑے بوڑھے نئے نئے اسکول جانے والے اور کم سواد بچوں ہی کا ہم گام اور ہم خیال رہنا پسند کریں تو پھر اس معاشرے کی ذہنی پستی اور فکری پس ماندگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

حواشی و منابع

۱۔ زوارہ کا شمار عراق عجم کے شہر کاشان کے توابع میں ہوتا ہے، دیکھیے: *لغت نامہ دہخدا*، تہران، ذیل ''زوارہ''۔

۲۔ استاد محمد محیط طباطبائی، *خیامی یا خیام*، بہ کوشش سیّد احمد محیط طباطبائی، تہران: ققنوس، ۱۳۷۰ شمسی۔

۳۔ استاد محمد محیط طباطبائی، *سیّد جمال الدین اسد آبادی و بیداری مشرق زمین*، بہ کوشش و مقدمۂ سید ہادی خسرو شاہی، تہران: دفتر نشر فرہنگ اسلامی، ۱۳۷۰ شمسی۔ استادِ مرحوم کے زیادہ تر حالات اسی کتاب کے مقدمہ (ص۸-۷) سے مأخوذ ہیں۔

۴۔ بار محمد محیط طباطبائی، *مجموعۂ آثار میرزا ملکم خان*، تہران، ۴۹-۱۹۴۸ء۔ میرزا ملکم خان (۱۲۴۹-۱۳۲۶ ھ-ق) کے بارے میں مزید معلومات کے لیے دیکھیے: محمد معین، *فرہنگ فارسی*، چاپ ہفتم، تہران: امیر کبیر، ۱۳۶۴ شمسی،

۵۔ دیکھیے ان کا مقالہ: ''اقبالؒ، شاعری کہ باید اورا درست شناخت''، *گوہر* (تہران)، دورۂ پنجم، شمارہ۶، شہریور ۱۵۶۳ شمسی، ص ۴۳۱-۴۲۳۔

۶۔ دیکھیے: ایضاً، ص ۴۲۳، استاد کی شخصیت پر مدیر مجلّہ کا تبصرہ ''از محققان و پژوہندگان طراز اوّلِ کشور''۔

۷۔ آربری کا یہ بیان کہ حضرت علامہ نے ۱۹۳۳ کا سال تعلیمی امور پر حکومت افغانستان کے مشیر کے طور پر وہاں گزارا

(Arthur J. Arberry, *Javid-Nama,* translated from the Persian with introduction and notes, London: George Allen & Unwin, 1966, p.9)

درست نہیں۔ سر راس مسعود، سیّد سلیمان ندوی اور حضرت علامہ کو ان امور پر رہنمائی اور مشورے کی خاطر نادر شاہ نے ستمبر ۱۹۳۳ء میں کابل آنے کی دعوت دی تھی۔ علامہ ۲۳/اکتوبر ۱۹۳۳ء کو کابل پہنچے اور ۲/نومبر ۱۹۳۳ء کو قندہار سے براستہ کوئٹہ لاہور کے لیے روانہ ہوگئے (جاوید اقبال، *زندہ رود (حیات اقبالؒ کا اختتامی دور)* لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۴ء، ص ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۲۷)۔ اس لحاظ سے حفیظ ملک اور لنڈا پی ملک کا یہ خیال کہ حضرت علامہ تقریباً چار ہفتے افغانستان میں رہے

(Hafeez Malik and Lynda P. Malik, "The Life of the Poet-Philosopher", in Hafeez Malik, ed., *Iqbal, Poet-Philosopher of Pakistan,* New York: CUP, 1971, p.31)

بھی مبنی برحقیقت نہیں۔

سرور خان گویا کی مہمانداری کے بارے میں دیکھیے: *زندہ رود*، ص ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۷۔ موصوف حضرت علامہ کی کابل آمد سے پہلے ہی ان کی شخصیت کے سحر میں آ چکے تھے۔ ملاحظہ ہو: عبدالسلام خورشید، *سرگزشت اقبالؒ*، لاہور: اقبالؒ اکادمی، ۱۹۷۷ء، ص ۴۴۳۔

۸۔ ملاحظہ ہو: سرور خان گویا، ''اقبالؒ و افغانستان''، *مقالاتِ یومِ اقبالؒ* ۱۹۷۶ء، مرتبہ یعقوب توفیق، کراچی: اقبالؒ کونسل، ۱۹۶۸ء، ص ۳۱-۲۷۔

۹۔ آقا سیّد محمد علی (داعی الاسلام)، *اقبالؒ وشعرِ فارسی*، حیدر آباد دکن: شعبہ جامعۂ معارف، ۱۳۴۶ ق/۱۹۲۸ء۔ سیّد محمد علی داعی الاسلام کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو:

M. Saleem Akhtar, "Seyyed Muhammad 'Ali Da'i al-Eslam", *Encyclopaedia Iranica,* New York: Columbia University, 1992.

۱۰۔ محیط طباطبائی، ''ترجمانِ حقیقت''، *ارمغان* (تہران)، سال نوزدہم، شمارہ ا، ص ۳۸-۲۵

۱۱۔ "To look a gift horse in the mouth"

۱۲۔ *کلیات مکاتیب اقبالؒ*، جلد سوم (جنوری ۱۹۲۹ء تا دسمبر ۱۹۳۴ء)، مرتبہ سیّد مظفر حسین برنی، دہلی: اُردو اکادمی،

ص ۳۷۷-۳۸۱

۱۳۔ شیخ عطاء اللہ، *اقبالؒ نامہ، مجموعۂ مکاتیب اقبالؒ*، حصہ دوم، لاہور: شیخ محمد اشرف، ۱۹۵۱ء، ص ۹۲

۱۴۔ مثال کے طور پر حضرت علامہ کو جاوید نامہ کی تیاری کے سلسلے میں منجملہ اور مآخذ کے سرّ السما وتسہیل السیارات تألیف ابو عبدالرحمٰن عبدالعزیز قرشی پرہاروی ملتانی (متوفی ۱۸۲۴ء) کو دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو مختلف اصحاب کو اس سلسلے میں خطوط لکھنے پڑے، اور جب تلاش بسیار کے بعد کتاب تک دسترس حاصل ہوگئی تو و مطلوبہ مقصد کے لیے کارآمد ثابت نہ ہوئی (دیکھیے: *کلیات مکاتیب اقبالؒ*، ج۳، ص ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۵۹، ۱۰۴۲ ۱۰۴۳، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰)۔ اسی ضمن میں آپ اپنے مجوزہ اثر کے بارے میں ایک مکتوب الیہ کو لکھتے ہیں: ''جہاں تک میرا علم ہے کسی اسلامی زبان میں اس قسم کی کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی۔'' (ایضاً، ص ۱۳۶)۔ ظاہ ہے اتنے بڑے منصوبے پر عمل کے لیے آپ نے اور کیا کیا ہفتخواں طے نہیں کیے ہوں گے۔

۱۵۔ *زندہ رود*، ص ۵۳۲

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ محمد رفیق افضل (مرتب)، *گفتار اقبالؒ*، لاہور: ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان، ۱۹۶۹ء، ص ۲۴۴؛ محمد عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، لاہور: اقبالؒ اکادمی، ۱۹۷۷ء، ص ۲۵۷-۲۵۸۔ نیز دیکھیے: اقبالؒ بنام ڈاکٹر ناموس شجاع منعم ۱۹۳۱/۱/۲۰، اور اقبالؒ بنام آمنہ بی بی ۱۹۳۴/۷/۳ء، در *کلیاتِ مکاتیب اقبالؒ*، جلد سوم، ص ۱۸۸، ۵۴۳

۱۸۔ *کلیات مکاتیب اقبالؒ*، ج۳، ص ۳۳۸

۱۹۔ محمد عبداللہ چغتائی، ص ۳۶۰-۳۶۱۔

۲۰۔ ایضاً ، ص ۴۸۹-۴۹۰

۲۱۔ (۱۸۷۳-۱۹۳۸ء)، مولانا محمد علی جوہر کے بڑے بھائی اور تحریک خلافت کے ممتاز رہنما۔ آپ کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو:

Naresh Kumar Jain, *Muslims in India: A Biographical Dictionary*, Lahore: Vanguard, 1985, Vol.II, pp.154-155, 70-72.

۲۲۔ *گفتار اقبالؒ*، ص ۲۳۲-۲۳۳

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ Sir Denison Ross (1871-1940) ، حالات کے لیے دیکھیے: *کلیات مکاتیب اقبالؒ*، ج۳، ص ۸۱۷-۸۱۹۔

۲۵۔ اقبالؒ بنام سیّد نذیر نیازی ۱۹۳۲/۵/۶ء، *کلیات مکاتیب اقبالؒ*، ج ۳، ص ۲۷۸

۲۹۔ Annemarie Schimmel, *Buck der Ewigkeit,* Munich, 1957.

۳۰۔ E. Meyerovitch and Mohammad Mokri, *Le Livre de l Eternite,* Paris, 1962.

۳۱۔ Shaikh Mahmud Ahmad, *The Pilgrimage of Eternity,* Lahore, 1961.

۳۲۔ Arthur John Arberry (1905-1969) کے حالات کے لیے دیکھیے: موسسۂ مطالعاتِ و تحقیقات فرہنگی (پژوہشگاہ)، *فرہنگ خاور شناسان،* جلد اوّل: آ، تہران: پژوہشگاہ، ۱۳۷۲ شمسی، ص ۷۴-۸۱

۳۳۔ A.J. Arberry, tr., *Tulip of Sinai,* London, 1967.

A.J. Arberry, tr., *Persian Psalms,* Lahore, 1948.

A.J. Arberry, tr., *Mysteries of Selflessness,* London, 1953.

۳۴۔ *Javid-Nama,* p.10

۳۵۔ ''نامہ ای کہ برای اقبالؒ فرستادہ نشد''، *ہنرومردم* (ویژہ نامۂ ایران و پاکستان)، (تہران)، آبانماہ ۲۵۳۶ شاہنشاہی [۱۹۷۸ء]، دورۂ روم، ص ۷۱-۶۷

۳۶۔ ایضاً، ص ۶۷

۳۷۔ *کلیات اقبالؒ* (فارسی)، لاہور: شیخ غلام علی، ۱۹۷۳ء، ص ۷۰۵

۳۸۔ ''نامہ ای کہ برای اقبالؒ فرستادہ نشد''، ص ۶۷

۳۹۔ باہتمام محمد ملک الکتاب، بمبئی: چاپخانۂ علوی، ۱۳۰۵ھ ق/ ۸۸-۱۸۸۷ء

۴۰۔ *کلیات اقبالؒ* (فارسی)، ص ۳۲۸-۳۳۰

۴۱۔ ایضاً، ص ۷۰۵

۴۲۔ ایضاً

۴۳۔ مثال کے طور پر دیکھیے: رفیع الدین ہاشمی، ''علامہ اقبالؒ کے غیر مطبوعہ رقعات بنام پروین رقم''، سہ ماہی مجلّہ *اقبالؒ ریویو،* ج ۲۴، شمارہ ۴ (جنوری ۱۹۸۴ء)، ص ۲۱۳، ۲۱۵

۴۴۔ عماد الدین میرزا طاہر بن میرزا حسین خان قزوینی، متخلص بہ وحید (م ۱۱۲۰ھ / ۰۹-۱۷۰۸ء)، مصنف *عباس نامہ* یا *تاریخ طاہر وحید* یا *تاریخ شاہ عباس ثانی؛* شاہ سلیمان صفوی (۱۰۷۸-۱۱۰۵ھ) کے عہد میں ۱۱۰۱ھ/ ۹۰-۱۶۸۹ء) میں عماد الدولہ کے لقب کے ساتھ وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوا۔ ملاحظہ ہو: *فرہنگ معین،* ذیل ''وحید قزوینی''۔

۴۵۔ شاہ طاہر بن شاہ رضی الدین اسماعیلی حسینی دکنی از مشاہیر رجال سیاسی قرن ء ہم ہجری، دیکھیے: ملا قاطعی ہروی، *تذکرۂ مجمع الشعرای جہانگیر شاہی،* باتصحیح و تعلیق و مقدمۂ محمد سلیم اختر، کراچی: موسسۂ تحقیقات علوم آسیای میانہ و

انتہائی فعال رکن، اور زبردست شاعر اور عالم خاتون جس نے اپنے ظاہری حسن، طلاقتِ لسان، علمی استعداد، مقصد سے غیر معمولی لگن اور ابتلا کی گھڑیوں میں مثالی استقلال، استقامت اور ثابت قدمی کے باعث بڑی شہرت پائی، اور بالآخر خواتین کی آزادی اور ان کے حقوق کے تحفظ کے ایک مظہر کے طور پر اسے دیکھا جانے لگا۔ مزید معلومات کے لیے دیکھیے:

L.P. Elwell-Sutton and D.M. MacEoin, "Kurrat al'Ayn", in The *Encyclopaedia of Islam,* New Edition, Leiden / London.

احمد کسروی، بہائیگری، تہران: فرخی، ت-ن، ص ۱۱۵-۱۱۱۔

۴۷۔ Edward G. Browne, *A Literary History of Persia,* 1924; Cambridge: Cambridge University Press, 1978 reprint, Vol. IV, p.153; E.G. Browne, *A Year Amongst the Persians,* London: Adam and Charles Black, 1893; and H.M. Balyuzi, *Edward Granville Browne and the Baha'i Faith,* London: George Ronald, 1970.

۴۸۔ حضرت علامہ کا براؤن (۱۸۶۲-۱۹۲۶) سے پہلا براہ راست رابطہ ۱۹۰۵ء میں کیمبرج پہنچنے پر ہوا اور پھر اس کی وفات تک بدستور جاری رہا۔ اقبالؒ اگرچہ براؤن کے لیے بمنزلۂ شاگرد کے تھے، لیکن فٹ نوٹ ۴۷ میں مذکور اپنی تاریخ ادبیات ایران (ص ۴۳۰-۴۳۱) میں اس نے بابی تحریک کے مآخذ پر روشنی ڈالتے ہوئے اس سلسلے میں حضرت علامہ کی تحقیقات سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ اخیرالذکر موضوع پر حضرت علامہ اور معروف ایرانی دانشور سیّد احمد کسروی (متولد ۱۲۶۹ ھ ق / ۵۳-۱۸۵۲ء؛ مقتولِ در تہران در ۱۳۲۴ھ ق / ۰۷-۱۹۰۶ء) کے خیالات (*بہائیگری*) کا موازنہ اور مقابلہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ علامہ کے براؤن کے ساتھ تعلقات کے لیے دیکھیے: *کلیات اقبالؒ* (اُردو)، دیباچۂ *بانگ درا* از شیخ عبدالقادر، اشاعت ہشتم، لاہور: شیخ غلام علی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۲، عبدالسلام خورشید، ص ۵۸؛ عبداللہ چغتائی، ص ۱۰۴، ۱۹۶-۲۰۱

۴۹۔ Muhammad Iqbal, *The Development of Metaphysics in Persia,* Lahore: Bazm-i-Iqbal, 1964 reprint, pp. 143-146; ----, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam,* ed. M. Saeed Sheikh, Lahore: Iqbal Academy, 1989 reprint, p. 121.; *Letters of Iqbal,* ed. B.A. Dar, 2nd edn., Lahore: Iqbal Academy, 1981, p.93.

کلیات اقبالؒ (فارسی)، (*جاوید نامہ، خطاب بہ نژاد نو*)، ص ۷۸۸۔ سیّد نذیر نیازی، *اقبالؒ کے حضور*، اشاعت

(*کلیاتِ اقبالؒ* (اردو)، اشاعت ہشتم، لاہور: شیخ غلام علی، ۱۹۸۹ء، ص ۵۰۸) حضرت علامہ کا تین اشعار پر مبنی ایک قطعہ درج ہوا ہے جس کا عنوان غالبًا کاتب کے تسامح کے باعث ''علی محمد باب'' کے بجائے ''محمد علی باب'' جما دیا گیا ہے جو درست نہیں۔ حضرت علامہ نے اسی فٹ نوٹ کے آغاز میں مذکور اپنی کتاب ''فلسفۂ عجم'' میں موصوف کا صحیح نام ''علی محمد باب'' ہی لکھا ہے۔

۵۰۔ لغت نامۂ دہخدا، تہران، ذیل ''طاہرہ''؛

J.E. Esslemont, *Baha'u'llah and the New Era, An Introduction to the Baha'i Faith*,Illinois: Baha' Publishing Trust, 1970, p.148.

۵۱۔ L. Massignon and L. Gardet, "al-Halladj" (244-309/857-922), *The Encyclopaedia of Islam,* New Edition, Leiden/London, 1971.

۵۲۔ ملاحظہ ہو فٹ نوٹ نمبر۳ میں مذکور سیّد جمال الدین افغانی پر ان کے مقالات کا مجموعہ۔ یہاں اس بات کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ سیّد جمال الدین افغانی کو ۱۸۹۷ء میں ان کی وفات کے بعد استنبول میں دفن کر دیا گیا تھا۔ افغان حکومت کی سلسلہ جنبانی پر دسمبر ۱۹۴۴ء میں حکومت ترکیہ نے ان کے جسد خاکی کو کابل لے جانے کی اجازت دے دی۔ اس سلسلے میں استاد محیط طباطبائی اپنے اسی مجموعے میں شامل ایک مقالے میں جو ۱۳۷۰شمسی میں لکھا گیا، رقمطراز ہیں کہ سیّد صاحب کا جسد خاکی خلیج فارس سے کراچی کی بندرگاہ پر لایا گیا (ص۱۲) اور ایک دوسرے مقالے میں جو ۱۳۵۰شمسی میں سپرد قلم کیا گیا، لکھتے ہیں کہ ان کا جسد خاکی ''از راہ ہوا'' استنبول سے کابل پہنچایا گیا(ص۲۵)۔ یہ دونوں باتیں مبنی بر حقیقت نہیں۔ صحیح صورت حال یہ ہے کہ ایک اعلیٰ افغانی وفد مرحوم کے تابوت کو استنبول سے بحری جہاز میں رکھ کر پہلے بمبئی لایا، جہاں سے اسے بذریعہ ٹرین براستہ دہلی، لاہور، پشاور پہنچایا گیا جہاں سے اس کی کابل منتقلی عمل میں آئی۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: غلام حسین ذوالفقار، *اقبالؒ، ایک مطالعہ،* لاہور: اقبالؒ اکادمی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۱۔

۵۳۔ اس سلسلے میں مزید معلومات کے لیے دیکھیے:

Khursheed Kamal Aziz, "Jamal al-Din' Afghani and India", *Remembering Some Great Men,* Lahore: Vanguard, 2002, pp. 50-75.

۵۴۔ *کلیاتِ اقبالؒ* (فارسی)، (ارمغانِ حجاز)، ص ۹۷۵

۵۵۔ ایضاً، ص ۹۷۶

۵۶۔ ایضاً (*جاوید نامہ*)، ص ۱۱۵-۱۱۶

۵۷۔ E.G. Browne (ed.), *The Ta'rikh-i-Jadid, or New History of the Mirza Muhammad Ali the Bab, by Mirza Husayn of Hamadan*, Cambridge: CUP

۵۸۔ کلیاتِ اقبالؒ (فارسی) (پیامِ مشرق)، ص ۲۲۹

۵۹۔ اس موضوع پر مزید معلومات کے لیے دیکھیے: یوسف سلیم چشتی، شرح جاوید نامہ، لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۶ء، ص ۸۴-۹۴؛ ایس-ایم-عمر فاروق، طواسینِ اقبالؒ، جلد اوّل، لاہور: اقبالؒ اکادمی، ۱۹۸۷ء، ص ۸۶-۱۸۰۔

۶۰۔ دیکھیے: فٹ نوٹس ۴۶، ۴۷ اور ۵۷ (فوق) میں مذکور مآخذ، اور لغت نامہ دہخدا، ذیل ''باب''؛ نیز
H. Algar, "Kazim Rashti"; A. Bausani, "Babis", *"Baha Allah"*, "Baha' is"; D. MacEoin, *"Shaykhiyya"*, in *The Encyclopaedia of Islam*, New Edition.

۶۱۔ اقبالؒ کے ملی افکار، ص ۲۶۶

۶۲۔ ایضاً، ص ۲۵۷؛ اقبالؒ کے حضور، ص ۲۹۶

۶۳۔ ملاحظہ ہو: فٹ نوٹ ۳۵ (فوق)

۶۴۔ یہ مقالہ ۲۵۳۶ شاہنشاہی (بمطابق ۱۳۵۶ شمسی / ۱۳۹۸ ہجری قمری / ۱۹۷۸ء) میں شائع ہوا تھا۔

۶۵۔ ہزارۂ حکیم ابوالقاسم فردوسی کا انعقاد ۱۳۱۳ شمسی میں عمل میں آیا۔ ملاحظہ ہو: وزارت اطلاعات و جہانگردی، ادارۂ کل انتشارات، مبدأ تاریخ شاہنشاہی، تہران، ۲۵۳۵ شاہنشاہی، ص ۲۲

۶۶۔ اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸ء-۱۷۰۷ء / ۱۰۶۸-۱۱۱۸ ھ ق) کا سب سے چھوٹا بیٹا جو ۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۷ء میں دلِ رَس بانو بیگم کے بطن سے پیدا ہوا۔ اُس نے تقریباً تیئس برس کے سن میں باپ کے خلاف بغاوت کر دی اور پھر بھاگ کر ایران چلا گیا جہاں اس نے اورنگ زیب کے اڑتالیسویں سالِ جلوس میں بمقام مشہد وفات پائی اور وہیں دفن ہوا۔ اس پر مزید معلومات کے لیے دیکھیے:
Saqi Musta'ad Khan, *Ma'asir-i-'Alamgiri,* trans. into English by Sir Jadunath Sarkar, Lahore: Suhail Academy, 1981 repr., pp. 320-22; Sir Jadunath Sarkar, *History of Aurangzib,* Karachi: South Asian Publishers, 1981, Vol. III, pp. 235-48; Riazul Islam, *A Calendar of Documents on Indo-Persian Relations (1500-1750),* Tehran: Iranian Cultural Foundation, 1979, pp. 456, 462, 464, 469.

۶۷۔ ملاحظہ ہو: فٹ نوٹ ۶۶ (فوق) اکبر بن اورنگ زیب ۱۱۱۶ ھ ق میں فوت ہوا۔

۶۸۔ دیکھیے: فٹ نوٹ ۱۰ (فوق)۔